ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.7,Issue No.1 (2025)
(January to March)

معاصر اُردو شعرا کی خود نوشت سوانح عمریوں کا تنقیدی مطالعہ

(بہ حوالہ خصوصی: ساقی فاروقی، محمود شام اور علی اکبر ناطق)

A Critical study of the autobiographies of contemporary Urdu poets (with special reference to Saqi Farooqi, Mehmood Sham and Ali Akbar Natiq)

حنا امیر
ایم۔فل اسکالر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا
ڈاکٹر سمیرا اعجاز
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

Hina Ameer
M. Phil scholar, Department of Urdu, University of Sargodha
Dr. Sumaira Ijaz
Department of Urdu, Associate professor, University of Sargodha

Abstract:
"Paap Beeti", "Sham BaKhir", and "Abad Hue Barbad Hue" have proved to be significant additions to the corpus of Urdu prose. Their authors, besides being autobiographers, are also poets; therefore, they have enhanced the beauty of their words with their unique aesthetic sense. In Saqi Farooqi's autobiography the dominant attitude is that of a critic. Because of this sensitivity, he often targets poets and writers for criticism over minor issues, and his tone and choice of words at times become bitter. In Paap Betti, the author has also employed certain modern terminologies and spellings that had not been seen in autobiographies writing before. Mehmood Sham, being a journalist, provides valuable information from a journalistic perspective in his autobiography. Having spent most of his life in politics and among political figures, he frequently mentions them in his narrative- especially Zulfiqar Ali Bhutto and his party- offering important insights about them. In Ali Akbar Natiq's autobiography, the dominant tone is that of a fiction writer, Therefore, his autobiography reflects cultural nuances, particularly those of village life and rural civilization.

Keywords: Autobiography, politics, civilization, journalist, imagination, political figures, cultural nuances

آپ بیتی اپنے فن کے لحاظ سے پیچیدہ صنف ہے، لیکن یہ کوئی بھی شخص لکھ سکتا ہے چاہے وہ ادیب ہو یا نہ ہو، اگر اُس کے پاس مواد ہے اور جو زندگی اُس نے گزاری ہے وہ دوسروں کو بتانے کے قابل ہے تو آپ بیتی لکھی جا سکتی ہے، لیکن آپ بیتی لکھنے کے لیے آپ بیتی کے فن سے آگاہ ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ انسان زندگی میں بہت سے حالات سے دوچار ہوتا ہے، اُن میں سے چند ایسے غیر معمولی واقعات ہوتے ہیں جو کہ ہمارے ذہن میں چھپ جاتے ہیں۔ ان واقعات میں اچھے اور بُرے دونوں اقسام کے حالات شامل ہو

سکتے ہیں۔ زندگی کے واقعات میں ہر واقعہ کو آپ بیتی میں بیان نہیں کیا جاتا بلکہ چند مخصوص واقعات کو ہی آپ بیتی کا حصہ بنایا جاتا ہے، اس لیے آپ بیتی لکھنے والے کو واقعات کے انتخاب میں بھی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ بیتی میں ایک انسان اپنی زندگی کے تمام واقعات، اُتاو چڑھاؤ نیز ہر حالات کو پیش کرنے کا ضامن ہوتا ہے اسی لیے اردو کی بعض آپ بیتیوں کو مکمل خیال نہیں کیا جاتا، کیوں کہ ان میں زندگی کے کئی پہلوؤں کو بیان نہیں کیا گیا۔ اِسی طرح ایک آپ بیتی نگار آپ بیتی میں تہذیبی، سیاسی، مذہبی، سماجی، معاشی اور معاشرتی پہلوؤں کو بھی پیش کر کے اپنے خیالات پیش کرتا ہے۔ اُردو ادب میں آپ بیتی کا رواج آہستہ آہستہ پروان چڑھا، مگر اکیسویں صدی میں یہ رواج عام ہونے لگا اور اس صنف میں مردوں، عورتوں، شاعروں کے علاوہ عام لوگوں نے بھی طبع آزمائی کرنا شروع کر دی۔ آپ بیتیاں ہر دور میں لکھی جاتی رہی ہیں اور اردو میں اس صنف کی مکمل روایت موجود ہے۔

اکیسویں صدی میں شائع ہونے والی چند اہم آپ بیتیاں میں عذرا عباس کی آپ بیتی "میرا بچپن" (۲۰۰۱ء)، ڈاکٹر جاوید اقبال کی آپ بیتی "اپنا گریباں چاک" (۲۰۰۲ء)، احمد بشیر کی آپ بیتی "دِل بھٹکے گا" (۲۰۰۳ء)، خواجہ محمد سعید کی آپ بیتی "گورنمنٹ کالج اور مَیں" (۲۰۰۴ء)، نور سجاد ظہیر کی آپ بیتی "میرے حصے کی روشنائی" (۲۰۰۵ء)، وقار بن الٰہی کی آپ بیتی "ماں میں تھک گیا ہوں" (۲۰۰۶ء)، کشور ناہید کی آپ بیتی "شناسائیاں رسوائیاں" (۲۰۰۷ء)، قتیل شفائی کی آپ بیتی "گھنگھرو ٹوٹ گئے" (۲۰۰۸ء)، منزہ سلیم کی آپ بیتی "پھول لاکھوں برس نہیں رہتے" (۲۰۱۰ء)، ناصرہ اقبال کی آپ بیتی "خواب جو حقیقت بنے" (۲۰۱۱ء)، شاہدہ بُخاری کی آپ بیتی "یہ عشق کی بازی ہے" (۲۰۱۲ء)، ملکہ پکھراج کی آپ بیتی "بے زبانی زباں نہ ہو جائے" (۲۰۲۰ء)، انعام الحق جاوید کی آپ بیتی "آئینہ مہ و سال" (۲۰۲۲ء)، مہ پارہ صفدر کی آپ بیتی "میرا زمانہ میری کہانی" (۲۰۲۳ء) شامل ہیں۔

ہر تخلیق کار کی ایک منفرد سوچ ہوتی ہے، جو اُسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اسی سوچ کی بنا پر ہی وہ عام سی بات کو اپنے تخلیقی صلاحتیوں کی وجہ سے دوسروں کے سامنے لاتا ہے۔ ایک تخلیق کار اپنی تخلیق میں سوچنے، محسوس کرنے اور مشاہدہ کرنے سے لے کر اپنے تجربات، مشاہدات اور خیالات کو بھی سامنے لاتا ہے، جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آپ بیتی ایک ایسی تخلیقی صنف ہے، جس کا تعلق انسان کی قوت حافظ اور مشاہدہ سے ہے، اگرچہ اس تخلیقی عمل میں زیادہ دخل یاد داشت کا ہوتا ہے، تاہم تخلیقی عمل کی تشکیل میں کئی دیگر عناصر بھی شامل ہیں، جن میں تخلیق کار کے لیے ساز گار ماحول، ذخیرہ الفاظ، گہرا مطالعہ و مشاہدہ، اس کا تجربہ، جذبہ احساس اور ذوقِ جمال وغیرہ شامل ہیں، نیز ان ہی عناصر کی بنا پر ایک شاعر ایک نثر نگار سے الگ لکھتا ہے۔ شعرا اپنی نثری تصانیف میں بھی شعری اصطلاحات کا نہ صرف استعمال کرتے ہیں، بلکہ اپنے تخیل اور سوچ کو الفاظ کے جامے میں ڈھال کر پیش کرتے ہوئے اپنی ایک شناخت بھی بناتے ہیں۔

آپ بیتی لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ بیتی لکھتے ہوئے نہ صرف اپنی خوبیاں بیان کرے، بلکہ خامیوں کا بھی اس خاص توازن سے ذکر کرے کہ آپ بیتی میں سیرت کا پہلو شامل نہ ہونے پائے۔ انسان بے شک اشرف المخلوقات ہے، لیکن اس کے باوجود انسان خطا کا پتلا ہے غلطی کا عنصر انسان کی فطرت میں شامل ہے، لیکن بعض دفعہ انسان اس غلطی کو چھپانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتا ہے، جو کہ آپ بیتی کی خامی ہے۔ اُردو ادب کی اکثر آپ بیتیوں میں یہ روش نظر آتی ہے۔ انسانی زندگی کے بہت سارے واقعات میں سے چند کا انتخاب کرنا قدرے مشکل کام ہے، لیکن صاحبِ تحریر کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ بیتی لکھتے ہوئے اُن واقعات کا انتخاب کرے، جن کے بیان کے بغیر اُس کی شخصیت مکمل نہ ہوتی ہو۔ آپ بیتی لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ واقعات کے بیان میں بچپن سے تاحال تک کا سفر زمانی ترتیب کو مدِ نظر رکھ کر طے کرے، جیسے ایک لڑی میں بہت سارے پھولوں کو ملا کر اُس کی مالا بنا دی

جائے۔ اُردو ادب کی بعض دوسری اصناف کی طرح آپ بیتی کا جنم بھی دکن سے ہوا۔ اُردو کی پہلی آپ بیتی کے بارے میں ناقدین کی آرا مختلف ہیں اس ضمن میں جعفر تھانیسری کی آپ بیتی کالا پانی، واجد علی شاہ کی پَری خانہ اور ظہیر دہلوی کی دَاستانِ غدر سامنے آتی ہیں، لیکن ناقدینِ ادب جعفر تھانیسری کی آپ بیتی کالا پانی جو کہ ۱۸۸۵ء میں لکھی گئی، کو اُردو کی پہلی آپ بیتی مانتے ہیں۔ اِس ضمن میں علم الدین سالک یوں لکھتے ہیں:

> "ہمارے یہاں آپ بیتیوں کا رواج ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد شروع ہوا۔ جس قدر ملک ترقی کرتا گیا اسی قدر زیادہ آپ بیتیاں لکھی جاتی رہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے آپ بیتی جو اردو زبان میں لکھی گئی وہ مولانا محمد جعفر کی "کالا پانی" ہے"۔ (۱)

درج بالا اقتباس میں علم الدین سالک نے وضاحت کی ہے کہ اردو ادب میں آپ بیتی کی روایت ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوئی۔ جوں جوں ملک ترقی کرتا گیا توں توں آپ بیتی کی روایت مضبوط ہوتی گئی۔ اس کے بعد انھوں نے جعفر تھانیسری کی آپ بیتی کالا پانی کو اُردو کی پہلی آپ بیتی کہا ہے۔ دراصل یہ آپ بیتی جعفر تھانیسری نے قید کے دوران لکھی تھی اور رہا ہونے کے بعد آپ بیتی کی صورت میں قید کے واقعات کو درج کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انگریزوں کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھاتا تھا۔ پہلی بار مولانا جعفر تھانیسری نے اِس روایت سے انحراف کرتے ہوئے آپ بیتی لکھی، لیکن بعض لوگ اِس آپ بیتی کو مکمل نہیں مانتے۔ تخلیقی عمل کا ادب میں اظہار دو طریقوں شعری اور نثری صورت میں کیا جاتا ہے، تاہم شعری اظہار تخلیق کا اعلیٰ معیار قرار دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں ہر دور میں مباحث جنم لیتے رہے ہیں۔ شعری اظہار کو کلامِ موزوں اور نثری اظہار کو کلامِ غیر موزوں سمجھا جاتا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، جس طرح رات کی تاریکی اور دن کے اُجالے میں فرق ہے اسی طرح کلامِ موزوں اور غیر موزوں میں بھی فرق ہے۔ کلامِ موزوں کو شعر کہا جاتا ہے، جو کہ شاعر تخلیق کرتے ہیں۔ شعر کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں کوئی اسے کلامِ موزوں خیال کرتا ہے تو کوئی موزوں الفاظ میں جذبات کے اظہار کو شعر کا نام دیتا ہے، کسی کے مطابق شعر ارادہ کر کے لکھا جاتا ہے تو کسی کے مطابق بغیر ارداے کے، لیکن رفیع الدین ہاشمی کے مطابق شعر میں تین چیزوں کا شامل ہونا بہت ضروری ہے، جن میں وزن، قافیہ اور ارادہ شامل ہیں (۲)، لیکن ان میں بھی بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں اگر قافیہ کو شعر کی شرط قرار دیا جائے تو بغیر قافیہ کے نظموں کو شاعری سے خارج کرنے کی ضرورت ہو گی، اسی طرح اگر ارادہ کر کے شاعری کی جائے تو آورد میں شامل ہو جائے گی اور آمد کی شاعری کو اردو ادب کے سرمایے سے خارج کرنا پڑے گا البتہ وزن کا شعر میں ہونا ضروری خیال کیا جاتا ہے، لیکن الطاف حسین حالی کے خیالات کو مدِ نظر رکھا جائے تو وہ شعر میں قافیہ اور وزن کو ضروری نہیں سمجھتے البتہ یہ دونوں شعر کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں، لیکن وہ نظم میں وزن کا ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ہمارے ہاں وزن بھی دو الفاظ استعمال میں آتے ہیں۔ ایک شعر اور دوسرا نظم اور جس طرح ان کے ہاں وزن کی شرط پوئٹری کے لیے نہیں بلکہ ورس کے لیے اسی طرح ہمارے ہاں بھی یہ شرط شعر میں نہیں بلکہ نظم میں معتبر ہونی چاہیے۔ (۳)

درج بالا اقتباس میں حالی نے بیان کیا ہے کہ وزن صرف نظم کے لیے ضروری ہے شعر کے لیے نہیں، البتہ یہ شعر میں اس کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ پُرانے دور میں اہلِ عرب عام لوگوں کی نسبت جو زبان پر مہارت رکھتا تھا یا تقریر و تحریر کر لیتا تھا اُسے شاعر سمجھتے تھے، اسی لیے جب آپؐ نے قرآن کا پیغام اہلِ عرب کو دیا تو انھوں نے آپؐ کو شاعر سمجھا۔ الطاف حسین حالی نے اردو ادب میں

شعر اور شاعر کی خصوصیات بیان کی ہیں، جو کہ بہت اہمیت کی حامل ہیں ان کے مطابق شعر میں سادگی، اصلیت اور جوش کا ہونا بہت ضروری ہے، نیز شاعر کو تخلیل، مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ کا خیال رکھنا چاہیے۔ قوتِ متخیلہ وہ طاقت ہے، جو اللہ تعالیٰ شاعر کو قدرتی طور پر عطا کرتا ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو ایک شاعر اور غیر شاعر میں فرق کا سبب بنتی ہے یہ جتنی مضبوط ہو گی شعر اتنا ہی شان دار ہو گا۔ اِسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر اور نثر میں فرق واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ہر وہ تحریر شعر ہے جو موزوں ہے، اور ہر وہ تحریر نثر ہے جو ناموزوں ہے۔ موزوں سے میری مراد وہ تحریر ہے جو جس میں کسی وزن کا باقاعدہ التزام پایا جائے، یعنی ایسا التزام جو دہرائے جانے سے عبارت ہو اور ناموزوں وہ تحریر ہے جس میں وزن کا التزام نہ ہو۔ (۴)

درج بالا اقتباس میں شمس الرحمٰن فاروقی نے بیان کیا ہے کہ ہر وہ تحریر شعر ہے جو موزوں ہے اور جس میں وزن کا اہتمام کیا گیا ہے اور ہر وہ تحریر نثر ہے جس میں وزن کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ شاعر بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ غیر شاعروں کے نسبت شعری اصطلاحات کے بہتر استعمال سے واقف ہوتے ہیں۔ ان کے کلام میں اختصار اور جامعیت پائی جاتی ہے ایک غیر شاعر نثر میں کئی صفحات پر مشتمل ایک بات مکمل کرتا ہے تو وہی بات شاعر ایک شعر میں ادا کر دیتا ہے، اگر شعر کو تخلیقی اظہار کہا جائے تو نثر اُس کا تعمیری اظہار ہو گا، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نثر میں تخلیقی اظہار نہیں ہوتا یہاں تخلیقی اظہار سے مراد یہ ہے کہ شاعری میں لفظ کی اپنی الگ منفرد پہچان ہے لیکن نثر میں لفظ کی پہچان مکمل جملے کے ذریعے ہوتی ہے، شعر میں لفظ علامتی، استعارتی یا تمثیلی معنی لیے ہوئے ہوتا ہے، اِسی طرح نثر میں علامات، استعارات یا تماثیل استعمال تو ہوتے ہیں، لیکن وہاں ایک اکیلا لفظ بطور علامت، استعارہ یا تمثیل نہیں ہو سکتا بلکہ ایک مکمل جملہ علامتی یا استعاراتی معنی دیتا ہے۔ شاعری میں استعارات بعض دفعہ عام فہم ہوتے ہیں تو بعض دفعہ مبہم، اس لیے ارسطو استعارے کو شعر کی روح قرار دیتے ہیں، جس میں شاعر اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ شاعر اپنے کلام میں زمر و عنایت اور کئی شعری حربوں کا استعمال کر کے ایک خاص بحر، قافیہ اور بعض دفعہ ردیف میں اس طرح لکھتا ہے کہ پڑھنے والا ایک نثر نگار کی نسبت شعر سے زیادہ متاثر ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں شعرا کو نثر نگاروں کی نسبت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور شاعری کو الہامی مانا جاتا ہے، اس لیے افلاطون نے شاعروں کو اپنی مثالی ریاست سے نکال دیا کہ وہ جنون کی حالت میں حواس باختہ ہو کے شاعری کرتے ہیں اور اس صورت میں غیر اخلاقی ادب تخلیق کرتے ہیں جو عوام کے منفی جذبات کو اُبھارتا ہے۔ شاعری میں عقل کا کوئی عمل دخل نہیں یہ خالصتاً دلی جذبات ہوتے ہیں اسی لیے غالب بازار میں بیٹھ کر کپڑے پر گرہ لگاتے رہتے اور گھر آ کر گرہ کھولتے اور اشعار دیوان میں درج کر لیتے۔

شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقی صلاحیتوں پر بچپن کے حالات، ماحول اور معاصر ادبی منظر نامے مختلف انداز میں اثرات مرتب کرتے ہیں بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ان کے تخلیقی عناصر ہی یہی ہوتے ہیں تو بے جا نہ ہو گا، تاہم شعرا نثری تصانیف میں اس کا اظہار نثری ادیبوں کی نسبت منفرد انداز میں کرتے ہیں۔ وہ اپنی نثر میں دل کشی پیدا کرنے کے لیے کہیں مقفیٰ و مسجع الفاظ کا تو کہیں آسان الفاظ کا استعمال کرتے ہیں، اِسی طرح کہیں وہ تکرارِ لفظی، فلیش بیک اور تجنیس کا استعمال کرتے ہیں تو کہیں اشعار سے اپنے اُسلوب کو چار چاند لگاتے ہیں۔ ایک شاعر نثر لکھتے ہوئے بیک وقت ایک شاعر اور نثر نگار ہوتا ہے، اس لیے وہ تحریر میں ان دونوں خصوصیات کو بروئے کار لاتے ہوئے نثر لکھتا ہے، یوں ایک شاعر نثر نگار سے بڑھ کر سوچنے سمجھنے کی طاقت رکھتا ہے اور اپنے نثری فن

پاروں میں مختصر اور جامع انداز میں وہی بات جو ایک ہے۔ اِن سب دلائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم شاعروں کو ادیبوں سے الگ خیال کرتے ہیں۔

ساقی فاروقی کی آپ بیتی "پاپ بیتی"

جدید اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے ہی شروع ہو گئے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے تحت ادیبوں نے جہاں دیگر اصناف کی پیش کش اور اسالیب میں تبدیلیاں کیں، وہاں آپ بیتی کے اظہار میں بھی بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ساقی فاروقی جو کہ ترقی پسند تحریک میں ایک معتبر نام تھا، وہی بعد میں اس تحریک کے شدید مخالف بن کر اُبھرے۔ اُن کی خود نوشت "پاپ بیتی" اکیسویں صدی کی آپ بیتیوں میں اہم اضافہ ہے۔ ساقی فاروقی اُردو ادب میں نہ صرف بطور شاعر بلکہ نثر نگار کی حیثیت بھی شہرت رکھتے ہیں۔ نئی نئی اصطلاحات اختیار کرنے اور بے باک اُسلوب کی وجہ سے ساقی فاروقی اردو ادب میں ایک الگ شناخت بناتے ہیں۔ اُردو ادب میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کی روش کو ترقی دیتا ہوا ساقی فارقی کا اسلوب اور تکنیک ان کی بطور نثر نگار ایک الگ پہچان بناتا ہے۔ ساقی فاروقی نے اپنے معاشرے میں موجود چھوٹی چھوٹی بُرائیوں کو نہ صرف اپنے گہرے مشاہدے کی بنا پر دیکھا بلکہ اُن کو تخلیقی انداز میں قاری کے سامنے پیش بھی کیا ہے۔

"پاپ بیتی" ساقی فاروقی کو بطور نثر نگار پیش کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اِسے ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی نے ۲۰۱۶ء میں شائع کیا، لیکن اشاعت سے پہلے یہ آپ بیتی کراچی کے ادبی مجلہ مکالمہ اور نیا ورق بمبئی کے رسالوں میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ آپ بیتی کا انتساب ساقی نے اپنے تمام دوستوں اور دشمنوں کے نام کیا ہے۔ مصنف اس خود نوشت کو یادوں کی بازیافت اور خوابوں کی بازگشت کہتے ہیں۔ آپ بیتی کے آخر میں مصنف نے خود نوشت کے دوسرے حصے کی اشاعت کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے۔ "پاپ بیتی" میں مصنف نے اشعار کا استعمال بھی کیا ہے۔ اپنے شعری ذوق کو ظاہر کرنے کے لیے اُنھوں نے آپ بیتی میں اپنے اشعار کے علاوہ دوسروں کے اشعار کو بھی درج کیا ہے۔ مصنف نے آپ بیتی میں ایسے بہت سے شعرا کا ذکر کیا ہے، جن کا کلام آج کل کے جدید دور میں ناپید ہو چکا ہے اور لوگ اُن سے اور اُن کے کلام سے واقف نہیں ہیں۔ ایک جگہ مصنف نے ایک غیر معروف شاعر فرید جاوید کا شعر درج کیا ہے اور قاری سے درخواست کی ہے کہ اگر وہ شاعر کو بھول گئے ہیں تو اُن کا یہ شعر کبھی نہ بھولیں۔ مصنف ان کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> جو لوگ فرید جاوید کو بھولتے جا رہے ہیں، اُن سے درخواست ہے کہ اُس کا یہ شعر کبھی نہ بھولیں:
>
> گفتگو کسی سے ہو تیرا دھیان رہتا ہے
> ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا(۵)

اس طرح کے کئی دیگر شعرا کا بھی ساقی نے تعارف کروایا ہے اور اُن کے کلام تک عام قاری کی رسائی کو ممکن بنایا ہے، جو کہ اُردو ادب کے لیے ایک بڑی خدمت ہے۔ آپ بیتی کے مصنف چوں کہ ایک شاعر ہیں اس لیے انھوں نے بعض مقامات پر خود ساختہ اصطلاحات کا استعمال بھی کیا ہے، جیسا کہ اُنھوں نے مرد کی جمع کے لیے مردود، نبٹا (نمٹا)، گناہ گار کو گنہ گار، اس کی جگہ تس، اصل میں یہ اہلِ کہل کی آخری معنوی اولاد ہیں۔ (میں نے اہلِ کہل کی ترکیب اصحابِ کہف کی دیکھا دیکھی بنائی ہے۔ ممکن ہے تاریخ میں اِن کا ذکر نہ ہو مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے، اس اختراع سے میرا مدعا ظاہر ہے۔) ہیہات، وصالیہ، پانچ کو پان، بساط (بسات بھی صحیح ہے)، پڑیا سے پڑیائیں، دُنیا سے دُنیائیں، سمندروں کے ملاپ کے لیے مرج البحرین، غافل کی جمع غُفلا، Color Blind کے لیے رنگو دھیا

وغیرہ جیسے منفرد الفاظ کا استعمال کیے گئے ہیں، جو پاپ بیتی کے علاوہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتے۔ آپ بیتی میں ساقی نے بعض دوسری زبانوں کے الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے، اُن زبانوں میں خاص طور پر انگریزی زبان کا استعمال کثرت سے ملتا ہے، بعض مقامات پر پورے پورے جملے بھی انگریزی زبان کے استعمال کیے گئے ہیں، اِس کے علاوہ ہندی الفاظ کا بھی استعمال ملتا ہے، جن میں یاترا، اٹوٹ سمبندھ وغیرہ۔

ساقی فاروقی اختصار کے قائل ہیں، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تمام تر واقعات کو انتہائی مختصر اور جامع انداز میں اپنی خود نوشت میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے آپ بیتی میں جذبات و احساسات کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ اپنے فنِ افسانہ نگاری کا استعمال بھی خوب طریقے سے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ بیتی میں خاکے، تشبیہ، تلمیح، محاورے، روزمرہ کا استعمال بھی فنی حوالے سے اہم نظر آتا ہے، تاہم اس سلسلہ میں عموماً مشکل الفاظ کا استعمال کیا ہے، اس کے علاوہ آپ بیتی میں ساقی نے انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کثرت سے کیا ہے۔ ان کے فن کے اظہار میں مشرقی و مغربی تہذیب کا تقابل ساقی کے فن کو مزید چار چاند لگاتا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف نے شاعروں، ادیبوں کا کثرت سے ذکر کیا ہے، نیز اُن کی شخصیت پیش کرتے ہوئے اچھائیوں سے زیادہ بُرائیوں کا پلڑا بھاری ملتا ہے۔ آپ بیتی میں ساقی نے بعض مقامات پر اخلاقیات کی پابندی نہیں کی اور فحش الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے، کہیں کہیں تو انھوں نے باقاعدہ طور پر گالیاں بھی لکھ دی ہیں، جیسا کہ حرام زادہ، سالی وغیرہ۔ ساقی چوں کہ ایک جذباتی انسان ہیں، اِس لیے بعض دفعہ وہ جوش میں ہوش کھو دیتے ہیں۔ آپ بیتی میں مصنف نے بڑے لطیف انداز میں جنسی بیانیے کا بھی سہارا لیا ہے۔ جنس نگاری کے لیے بہت دلیری اور بہادری کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ منٹو اور عصمت کی طرح ہر ادیب کٹہرے میں کھڑا نظر آئے گا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ایک دن میں اپنے کمرے میں آٹو گراف دے رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ بے چاری لڑکی نے سر سیمگی کے عالم میں جلدی جلدی اپنی شلوار پہنی۔ میں نے جیسے تیسے پتلون چڑھائی۔ اِس ساری کاروائی میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے۔ دروازہ کھولا تو اختر انصاری اکبر آباری اور حمایت علی شاعر مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔(۶)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے جنسی عمل کو ایک نئے انداز میں بیان کیا ہے۔ مصنف نے آپ بیتی میں بعض مقامات پر بہت برجستہ الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ساقی کا لہجہ بہت بے باک ہے، لیکن جنسی موضوع پر لکھتے ہوئے انھوں نے بھی بہت احتیاط کی ہے، اِس لیے ڈھکے چھپے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ساقی فاروقی نے شاعرانہ جبلت کی وجہ سے آپ بیتی میں ایسے منفرد الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے، آپ بیتی میں مصنف نے اشعار کا نہ صرف استعمال کیا ہے بلکہ بعض مقامات پر دوسروں کے اشعار میں ردوبدل کے ساتھ پیروڈی بھی پیش کرتے ہیں، نیز دوسرے شاعروں کے کلام میں تلفظ اور وزن کی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ آپ بیتی میں ساقی فاروقی نے تنقید بھی کی ہے اور تنقید کرتے ہوئے اُن کا لہجہ خاصہ تلخ معلوم ہوتا ہے، وہ بہت کھلے اور بے باک انداز میں نہ صرف اپنے مخالف بلکہ دوستوں پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ مصنف نے آپ بیتی میں فراز کو دوغلا اور لالچی لکھا ہے۔ اِسی طرح ایک موقع پر وہ وزیر آغا اور محمد میمن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> افسوس کہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وزیر آغا (اور ان کا جاہل گروپ) سلیم سے خبثِ باطنی رکھتے تھے (شاید اب بھی رکھتے ہوں)۔ نظم کی ایک نقل Islamic Studies کے

پروفیسر محمد میمن کو بھی بھیج دی۔ حالاں کہ آدمی بوراور بودا ہے اور اپنی گفتگو میں بونگی بونگی باتیں کرتا ہے۔ بے چاراترجموں پر گزراکر رہا ہے۔(۷)

درج بالا اقتباسات میں ساقی کی بے باکی ظاہر ہوتی ہے کہ اُنھوں نے بغیر کسی خوف کے فراز، پروفیسر محمد میمن اور وزیر آغا جیسے بڑے ناموں کے لیے دوغلا اور لالچی، بور اور ترجمے پر گزارا کرنے والا، وزیر آغا کا سلیم احمد سے حسد کرنا اور اُن کے گروپ کے لیے جاہل جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مشفق خواجہ بطور نقاد ساقی فاروقی کے سخت لہجے کے بارے میں لکھتے ہیں:

ساقی نے اقبال کے بعد شاعروں میں سے فیض، راشد اور میراجی کو ریاعتی نمبر دے کر پاس کر دیا ہے اور باقی سب شاعروں کو" چھٹ بھئے" اور چپڑ قناتی کہ کر ان کی عزت افزائی کی ہے۔ ترقی پسند شاعروں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس انفرادی لہجہ نہیں ہے۔ یہ سب ایک ہی جیسی باتیں ایک ہی جیسے انداز میں کرتے ہیں۔(۸)

زیرِ بحث اقتباس میں مشفق خواجہ نے ساقی فاروقی کے بارے میں ایک نقاد کی طرح خیال ظاہر کیا ہے کہ ساقی نے میراجی، راشد اور فیض کو پسند کیا ہے انھیں ریاعتی نمبر زدے کر پاس کر دیا ہے، لیکن دوسرے تمام شاعروں پر تنقید کی ہے۔ اس کے بعد وہ ترقی پسندوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ سب ایک جیسی شاعری کرتے ہیں اور ایک جیسا انداز اختیار کرتے ہیں۔ اِسی طرح مصنف نے آپ بیتی میں مذہبی حوالے سے بھی تنقید کی ہے، تنقید کرتے ہوئے بھی مصنف کا لہجہ سخت اور بہت بے باک ہے۔ مذہب ایک ایسی چیز ہے، جس پر آواز اُٹھانا آسان کام نہیں ہے۔ ساقی آپ بیتی میں خاص طور پر مولویوں سے متنفر نظر آتے ہیں اور اُن کی عادات و خصائل کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُن کے پسینے سے آنے والی بدبو، جھاڑو جیسی داڑھی، شلواروں پر لگے ہوئے زرد دھبوں سے ساقی کو کراہت ہوتی ہے اور اُن کے احساسِ جمال کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ آپ بیتی میں ساقی نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ عیسائی، یہودی اور ہندوؤں کے ملاؤں پر بھی تنقید کی ہے۔ ایک جگہ عیسائیوں اور یہودیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

عیسائیوں اور یہودیوں سے میری ملاقات تو ۱۹۶۳ء کے بعد ہوئی مگر تلک لگائے ہوئے، دھوتی پہنے ہوئے، جنیو ڈالے ہوئے،۔۔۔۔۔ہر سال سیکڑوں مسلمانوں اور اب عیسائیوں کو بھی مولی گاجر کی طرح کاٹتے ہوئے ہندو بنیاد پرست کٹھ ملا، اتنے ہی ذلیل، مکروہ اور عیار ہیں جتنے دوسرے مذہبی تنگ نظر دلدّر جو بھائی چارگی اور انسانیت کے نام پر حیض کا دھبّا ہیں۔(۹)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے عیسائیوں اور یہودیوں کے کٹھ ملاؤں کی عادات و خصائل کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے دھوتی ڈالنے، رانوں، پنڈلیوں اور بانہوں پر سرسوں کا تیل لگانے، مونگ پھلی اور چنے کھانے اور مولی کو ہضم کرتے ہوئے ڈیکار لینے، اپنے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بہوؤں کے سامنے ہری اوم ہری اوم کہنے اور ہر سال عیسائیوں اور مسلمانوں کو سینکڑوں کی تعداد میں مولی گاجر کی طرح کاٹنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہاں ساقی ہر مذہب کے پیشواؤں سے بے زار ہیں اور ان کی حرکات سے نفرت کرتے ہیں اور ان حرکات کی وجہ سے سب کو انسانیت کے نام پر دھبا سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی سوانح پیش کرتے ہوئے اپنے مذہب کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ میں صرف اِس وجہ سے مسلمان ہوں کیوں کہ میرے والدین مسلمان تھے۔ فاروقی کا تیز مزاج طنز و تنقید کی صورت میں نظر آتا

ہے۔ آپ بیتی میں اپنی سوانح پیش کرتے ہوئے مصنف نے نہ صرف اپنا مذہب پیش کیا ہے بلکہ مولویوں اور مفتیوں سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کیا ہے۔ بلاشبہ ساقی مختصر لکھنے کے قائل ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے آخری دو ابواب میں ن۔م۔ راشد اور فیض احمد فیض کی سوانح پیش کرتے ہوئے طویل واقعات درج کیے ہیں۔

ساقی فاروقی کی فکر ارتقائی منازل طے کرتی نظر آتی ہے، جس میں پختگی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی فکر مذہب، ادب اور تہذیب کے گرد گھومتی محسوس ہوتی ہے اور اس کی بدولت اپنی فکر کو کسی خاص منزل کی جانب رواں کرتے ہیں۔ ساقی خود کو مسلمان صرف اس صورت مانتے ہیں کیوں کہ یہ اُن کے والدین کا مذہب تھا وہ نہ مسلمان ہونے سے انکار کرتے ہیں اور نہ ہی اقرار بلکہ شک کے مرحلے پر فائز ہیں۔ آپ بیتی میں مولویوں کے روپ میں چھپے متعصب پسند لوگوں کی سوچ ظاہر کرتے ہیں۔ ساقی کا رویہ تہذیب، ادب اور مذہب کے لیے سخت ثابت ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ساقی کی فکر کا محور تقریباً یہی تینوں رہے ہیں۔ وہ مغربی تہذیب سے متاثر ہیں نیز ادب میں بے باک لہجے کی وجہ سے شاعروں اور ادیبوں پر تنقید کرتے ہیں، جہاں طنز و مزاح کا عنصر بھی نظر آتا ہے اور مذہب میں ساقی عاجزانہ انداز میں خود کو محمدؐ کا آدمی مانتے ہیں اللہ کا نہیں، کیوں کہ وہ خود کو اس قدر عاصی و گناہ گار مانتے ہیں جو ابھی عرفانِ الٰہی تک نہیں پہنچ پایا۔ مذہبی پہلو میں ساقی ہر مذہب کے راہنماؤں پر تنقید کرتے ہیں ان کے نزدیک صرف انسانیت کا مذہب ہی اچھا نظر آتا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف اپنے شاعر ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے طویل نظمیں بھی درج کی ہیں، نیز اپنی تخلیقات کا جابجا ذکر کیا ہے، ساقی کی فکر پر نرگسیت کا غلبہ واضح نظر آتا ہے۔ ساقی کی فکر پر اس کا بے باکانہ انداز بھی اثر انداز ہوتا ہے، کسی جگہ پر تنقید کرتے ہوئے تو کہیں فحش نگاری کی صورت میں بھی بے بکانہ انداز سامنے آتا ہے۔ ساقی کی فکر پر مغربی تہذیبی کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں جبکہ مشرقی تہذیب سے ان کی فکر فرار حاصل کرتی دکھائی دیتی ہے۔

"پاپ بیتی" میں ساقی فاروقی نے آخری دو ابواب راشد اور فیض کی تفصیلات درج کرنے میں صرف کیے ہیں۔ یہ ابواب بلاشبہ آپ بیتی کے معیار کو کمزور کر دیتے ہیں، لیکن ان ابواب میں ساقی کا اُسلوب بالکل بدلا ہوا ہے۔ وہ ایک نثر نگار کی طرح رواں اُسلوب اختیار کرتے ہیں، جو اپنے اندر ایک مکمل کہانی اور دلچسپی لیے ہوئے ہے۔ آپ بیتی کے آخری دو ابواب میں ساقی کی نثری خصوصیات کھل کر سامنے آتی ہیں۔

"پاپ بیتی" میں ساقی کا اُسلوب دلچسپ ہونے کے علاوہ بہت بے باک ہے، وہ بغیر ڈرے کسی پر بھی چاہے، وہ اُن کا دوست ہو یا دشمن تنقید کرتے ہیں۔ آپ بیتی کے آغاز کے چند صفحات میں اُن کا اُسلوب مشکل ثابت ہوتا ہے، لیکن آگے چل کر اُن کا یہی اُسلوب بدل کر عام فہم ہو جاتا ہے۔ آپ بیتی کے اُسلوب میں ساقی مختلف حربے استعمال کرتے نظر آتے ہیں، کہیں وہ خاکہ نگاری تو کہیں طنز و مزاح، کہیں تشبیہ تو کہیں تلمیح، کہیں محاورا تو کہیں روزمرہ، کہیں نقشہ نگاری تو کہیں منظر نگاری کا استعمال کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔ پُرانے اور روایتی الفاظ اور اصطلاحات کو استعمال کرنے سے گریز کرتے ہوئے نئے الفاظ و اصطلاحات بناتے ہیں۔ آپ بیتی میں ایک مقالے کی طرح حوالہ و حواشی کا اہتمام کیا گیا ہے، جس میں انگریزی کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے بعض مقامات پر طویل اقتباسات انگریزی میں درج کیے ہیں۔ "پاپ بیتی" کے مصنف نے آپ بیتی میں اپنی تجربات و مشاہدات پیش کیے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بے باک لہجہ استعمال کیا ہے۔ آپ بیتی مصنف کی ذات کی عکاسی کرتے ہوئے ان کے مزاج میں موجود خامیوں کی بھی نشان دہی کرتی ہے۔ لفظ پاپ گناہ کا معنی دیتا ہے اس لیے ساقی فاروقی نے اپنی آپ بیتی کو گناہ قرار دیتے ہوئے اسے پاپ بیتی کہا ہے۔ ساقی فاروقی کی آپ بیتی چند خامیوں کے باوجود اُردو ادب میں فنی، فکری اور اسلوبی حوالے سے ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ فنی حوالے سے آپ بیتی کے

مصنف نے اختصار سے کام لیا ہے، لیکن اس کے باوجود بعض دفعہ وہ واقعات کے دھارے میں بہنے سے خود کو روک نہیں پاتے۔ راشد و فیض شناسی آپ بیتی میں سقم کا باعث بنتی ہے۔ مشرقی تہذیب کو پس پشت ڈالتے ہوئے ساقی نے آپ بیتی میں مغربی تہذیب کو پسند کیا ہے۔ اُسلوبی خصوصیات کو نکھارتے ہوئے ساقی نے نہ صرف بے باک انداز اختیار کیا ہے بلکہ کئی حربوں کو استعمال کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔

محمود شام کی آپ بیتی "شام بخیر"

"شام بخیر" عصرِ حاضر میں لکھی جانے والی اہم آپ بیتیوں میں شامل کی جاتی ہے۔ محمود شام آپ بیتی نگار ہونے کے علاوہ ناول نگاری، کالم نویسی، سفر نامہ نگاری اور صحافت کے میدان میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ دسمبر ۲۰۲۳ء میں اٹلانٹس پبلی کیشنز سے ۳۷ عنوانات اور ۸۶۰ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم آپ بیتی، جسے انھوں نے اباجی اور بی بی کے نام کیا ہے محمود شام کے ادبی کارناموں میں اہم مقام رکھتی ہے۔ یہ طویل آپ بیتی دراصل ڈائری میں درج یاداشتوں پر مبنی ہے، جس کی وجہ سے بعض مقامات پر اس کی ترتیب میں خلل پیدا ہوا ہے۔ مصنف نے آپ بیتی کا آغاز روایت سے ہٹ کر کیا ہے وہ آغاز میں اپنے آباؤاجداد اور والدین کا ذکر کرنے کی بجائے آپ بیتی کا دورانیہ پیش کرتے ہیں، جو کہ ۱۹۴۰ء سے ۲۰۲۳ء ہے۔ اُن کے مطابق انھوں نے اپنی زندگی کے اسی سال اس آپ بیتی میں بیان کیے ہیں۔ آپ بیتی کے اختتامی ابواب میں انھوں نے اپنے خاندان کے بارے میں تفصیلات درج کی ہیں۔

محمود شام نے صحافت میں رہتے ہوئے مجیب الرحمٰن، ضیاء الحق، ایوب خان، بے نظیر بھٹو، ذوالفقار علی بھٹو، نواز شریف اور آصف علی زرداری کے ادوار دیکھے اوران سب میں وہ ذوالفقار علی بھٹو سے بہت متاثر ہوئے اور اُن کی قربت میں رہے۔ آپ بیتی میں مصنف نے کثرت سے ادبی اور سیاسی شخصیات کا ذکر کیا ہے، جو اس آپ بیتی کو تذکرہ نویسی کے قریب کرتا ہے اور ایسے لگتا ہے جیسے ہم ایک تذکرے کا مطالعہ کر رہے ہوں۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> اخبارِ جہاں کے مدیر اعلیٰ میر حبیب الرحمٰن ہیں۔ مینجنگ ایڈیٹر جاوید رحمٰن، جو ابھی زیرِ تعلیم بھی ہیں۔ یہ نیچے دوسری منزل پر بیٹھے ہیں۔ پہلی منزل پر 'جنگ' ہے۔ جہاں ابراہیم جلیس بیٹھے ہیں۔ سید محمد تقی۔ یوسف صدیقی۔ افضل صدیقی۔ شفیع عقیل میگزین ایڈیٹر۔
>
> (۱۰)

درج بالا اقتباس میں محمود شام نے اخبارِ جہاں سے وابستہ چند ادبی شخصیات کا ذکر کیا ہے اور وہ جہاں جہاں بیٹھتے ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے، جو کہ آپ بیتی یں ایک تذکرے کے عناصر شامل کرتا ہے۔ "شام بخیر" میں مصنف نے اپنے منفرد انداز، بے باک لہجے اور اُسلوب کی چاشنی کی وجہ سے اِسے دوسروں سے الگ بنایا ہے۔ مصنف چوں کہ براہِ راست سیاسی لیڈروں اور حکمرانوں کے ساتھ رہ چکے ہیں اور اپنے گہرے مطالعے اور مشاہدے کی بنا پر پاکستان کی سیاست کے مختلف ادوار دیکھ چکے ہیں اس وجہ سے وہ پاکستانی سیاست کے اسرار و رموز سے واقف ہیں۔ فوج، جنرلوں اور سیاسی لیڈروں کے کردار اور اُن کی سیاست کے تمام داو پیچ سے وہ جانتے ہیں اور ان سب کا ذکر انھوں نے آپ بیتی میں کر کے اس کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔ سیاست کے بارے میں لکھنے اور بڑے بڑے حکمرانوں پر تنقید کرنے کے لیے قلم میں طاقت اور دل میں بہادری ہونا ضروری ہے، جو کہ اُن میں موجود ہے اس لیے انھوں نے بڑے آسانی سے آپ بیتی میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اِسی طرح فوجی راج کی مزاحمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مثالی طور پر کچھ بھی کہا جائے تلخ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی مسلح افواج اب ریاست کا سب سے بڑا ستون ہیں۔ آئین کچھ بھی کہتا ہو۔ انتظامیہ، مقنّنہ۔ عدلیہ۔ میڈیا سب متحد ہو کر بھی فوج کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔۔۔۔ ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ اب اگر ادارے کی اصطلاح استعمال کی جائے تو فوراً ذہن صرف فوج کی طرف جاتا ہے۔(۱۱)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے واضح انداز میں فوج کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فوج پاکستانی ریاست میں ایک بڑے ستون کی حیثیت اختیار کر گئی وہ عدلیہ، مقنّنہ اور آئین ہر چیز کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ یہاں انھوں نے اس حد تک بھی لکھا ہے کہ ادارے کی اصطلاح استعمال کرنے پر ذہن فوج ہی کی طرف جاتا ہے۔ اس اقتباس میں مصنف فوج کے خلاف نظر آتے ہیں اور سیاست میں فوج کی مداخلت کو بہت طوالت سے بیان کرتے ہیں۔ محمود شام کا تعلق صحافت سے تھا، اس لیے انھوں نے آپ بیتی میں رسائل و جرائد کا کثرت اور طوالت سے ذکر کیا ہے، جو کہ قاری میں اکتاہٹ پیدا کرتا ہے۔ مصنف نے آپ بیتی میں ادبی شخصیات کا ذکر کیا ہے، جو کہ اس آپ بیتی کو تذکرے کے قریب کرتا ہے۔ محمود شام ایک ناول نگار ہیں اس لیے انھوں نے آپ بیتی میں قاری کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے تشبیہات، محاورات اور تلمیحات کا بھی استعمال کیا ہے اور داستانوی نوعیت کا اُسلوب اختیار کیا ہے، لیکن اس کے باوجود بعض مقامات پر قاری اکتا جاتا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف نے اپنی تصانیف کا کثرت سے ذکر کیا، جن میں ان کے ناول، غزلیں، نظمیں اور سفر نامے شامل ہیں ان کا بیان مصنف کی شخصیت میں خود نمائی اور نرگسیت کو ظاہر کرتا ہے۔ آپ بیتی میں اکثر مصنف واقعات میں بے جا طوالت اختیار کرتے ہیں، جو اس کے فن کو کمزور کرتا ہے۔ بے جا طوالت کے باعث آپ بیتی میں بعض مقامات پر پروف کی غلطیاں سامنے آئیں ہیں، جو کہ اس کے فن کی کمزوری کا باعث بنتی ہیں۔ مصنف نے آپ بیتی کے کئی حصوں میں بھٹو کے بارے میں واقعات بیان کیے ہیں، وہ آپ بیتی کے آغاز میں بھٹو کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی پھانسی کا ذکر کرتے ہیں، نیز اختتام پر بھی اُن کے کے دور کی تفصیلات درج کی ہیں، جو کہ آپ بیتی کی ترتیب میں نہ صرف خلل پیدا کرتا ہے بلکہ اس کے فن کو بھی کمزور کرتا ہے۔

"شام بخیر" کے مصنف نے اکثر مقامات پر اپنی تخلیقات کا ذکر کیا ہے، جن میں رسائل و جرائد کے علاوہ نظمیں، غزلیں، نغمے اور شعری مجموعے وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے بعض مقامات پر نہ صرف اپنی تصانیف کا ذکر کیا ہے بلکہ ان کی وضاحت بھی درج کیا ہے، جیسا کہ کارڈیو سپازم اور روبرو کا تفصیلی ذکر آپ بیتی میں موجود ہے۔ اِسی طرح مصنف نے بعض مقامات پر منفرد لہجہ استعمال کیا ہے۔ اردو ادب کے موجودہ رسم الخط میں الفاظ کو ملانا مستعمل نہیں ہے، لیکن انھوں نے آپ بیتی میں الفاظ ملا کر لکھے ہیں، جیسا کہ قلمبند، کیونکہ وغیرہ۔ اسی طرح بعض مقامات پر شائع کو وہ "شایع لکھتے ہیں۔ "شام بخیر" میں بعض مقامات پر پروف کی غلطیاں سامنے آئی ہیں، جیسا کہ ایک جگہ دوسری کو "دسری" لکھا ہے: دسری طرف برماتک"۔ صاحب کو "صاہب"، منیجمینٹ کو "منیجمنٹ وغیرہ جیسی غلطیاں فنی لحاظ سے آپ بیتی کے کمزوری ثابت ہوتی ہیں۔ آپ بیتی میں مصنف نے آغاز سے انجام تک رسائل و جرائد سمیت خوب صورت تصاویر کا استعمال کیا ہے، جو اس کے فن کو مضبوط بناتی ہیں۔

محمود شام نے بیرون ملک پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لیے بہت سے اسفار کیے، جن میں دو دفعہ انڈیا، چین، ڈنمارک، سویڈن، کویت، سعودی عرب اور دمشق وغیرہ کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ سفر نامہ نگار ہونے کی بنا پر وہ جہاں جاتے اور رہتے وہاں کے احوال کو سفر نامے کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اس دوران انھوں نے وہاں کی تہذیب پر بھی گہری نظر ڈالی ہے، یوں اُن کی تحریروں میں مشرقی اور مغربی تہذیب کا مرکب نظر آتا ہے۔ ایک جگہ بے نظیر بھٹو کی شادی طے ہونے کے بعد اُن کا گھر سے باہر نکلنے، تعزیتوں

پر جانے اور پارٹی کے لوگوں سے ملنے پر اعتراض کرتے ہیں کہ ایک دلہن کو ایسے نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ اس دوران جن بھوتوں کے اثرات ہونے کے خدشات زیادہ ہوتے ہیں۔ ایک جگہ سندھ کی تہذیب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سندھی اپنی روایتی مہمان نوازی کے لیے مشہور ہیں۔ ناشتہ بھی بھرپور ہوتا ہے۔ جس میں بھنڈی لازمی ہوتی ہے۔ ناشتے کے دو گھنٹے بعد چائے مگر یہ بھی پورا کھانا ہی ہوتا ہے۔ اس میں بھی بھنڈی ضروری ہے۔ مرغی۔ پکوڑے۔ سموسے۔ پھر دوپہر کا کھانا۔۔۔(۱۲)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے سندھ کی تہذیب پیش کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ وہ لوگ مہمان نوازی میں طاق ہیں، ان کی تہذیب میں بھنڈی لازمی جزو سمجھی جاتی ہے۔ ناشتے کے دو گھنٹے بعد چائے پیش کی جاتی ہے، جس کے لوازمات کھانے کی طرح ہوتے ہیں۔ "شام بخیر" سیاسی حوالے سے ایک اہم آپ بیتی ہے، جس میں مصنف نے سیاسی حکمرانوں خاص طور پر ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو اور نصرت بھٹو کے بارے میں ایسی معلومات قاری کو دی ہیں، جس سے پہلے وہ لاعلم تھا۔ چوں کہ مصنف بھٹو خاندان کے بہت قریب رہے ہیں، اس لیے انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی کتاب "عظیم المیہ "Great Tragedy اور بے نظیر کے کتابیں The Way Out (ایک ہی راستہ) اور Daughter of the East وغیرہ کو بھی درج کیا ہے۔ آپ بیتی میں انھوں نے طنز و مزاح سے بھی کام لیا ہے ان کا حسِ مزاح پھیکا ہے اور طنز میں بھی نشتریت نہیں البتہ تنقید کرتے ہوئے اُن کا لہجہ تلخ ہو جاتا ہے۔ وہ بڑے بڑے حکمرانوں اور سیاست دانوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے بے باک انداز اختیار کرتے ہیں نیز وہ صحافت اور سیاست کے بارے میں لکھتے ہوئے الفاظ کے چناؤ پر خاص توجہ دیتے ہیں، وہ ان الفاظ کی مدد سے ہی اپنی تحریروں کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ ان کے اسی فن کے بارے میں ڈاکٹر غلام شبیر رانا لکھتے ہیں:

> محمود شام نے لفظ کی حرمت اور قلم کا احترام ملحوظ رکھا۔ حریت فکر کے مجائد کی حیثیت سے انھوں نے حق و صداقت کی آواز بلند کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ان کا نصب العین رہا ہے۔ وہ قوم کا ضمیر ہیں۔ انھوں نے ایک ایسی ذہنی فضا تعمیر کی جس کے اعجاز سے آزادی کے ثمرات اور سلطانی جمہور کے بارے میں حقیقی آگہی پروان چڑھانے میں مدد ملی۔ تاریخ میں ان کے وقار اور سربلندی کا ذکر ہمیشہ ہنر کے الفاظ میں کیا جائے گا۔(۱۳)

زیرِ بحث اقتباس میں غلام شبیر رانا نے محمود شام کے الفاظ کی حرمت بیان کرتے ہوئے انھیں قوم کا ضمیر اور حق کے لیے آواز بلند کرنے والا قرار دیا ہے، جسے تاریخ میں اپنے الفاظ کے وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ "شام بخیر" میں محمود شام ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے خاندان سے متاثر ہیں اس لیے آپ بیتی میں ان کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ طنز کرتے ہوئے انھوں نے منفرد اور دھیمہ انداز اختیار کیا ہے، لیکن یہی انداز جب تنقید کی صورت میں سامنے آتا ہے تو وہ سیاست دانوں اور حکمرانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور ان کے لہجے کی تلخی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ آپ بیتی میں انھوں نے اپنی تخلیقات کا کثرت سے ذکر کیا ہے، بعض مقامات پر طویل نظمیں اور غزلیں پیش کی ہیں جو خود نمائی کو ظاہر کرتی ہے۔ ادبی محفلوں، مشاعروں اور تقاریب کا ذکر کرتے ہوئے وہ ادبی شخصیات کو بھی بیان کرتے ہیں، جو آپ بیتی میں تذکرے کے اثرات پیدا کرتا ہے۔ مصنف کا تعلق صحافت سے تھا اس لیے وہ کئی اخبارات و رسائل

سے وابستہ رہے ان کا ذکر وہ بڑی طوالت سے کرتے ہیں، جو بعض مقامات پر قاری کے لیے بے زاری اور اکتاہٹ کا باعث بنتا ہے۔ آپ بیتی میں خوب صورت تصاویر قاری کی دلچسپی بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

"شام بخیر" میں یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے مصنف نے آپ بیتی میں شام کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے، یہاں شام سے مراد زندگی کی شام ہے۔ مصنف نے چوں کہ ایک بھرپور زندگی گزاری اور بہت سے لوگوں سے ملے، کئی ممالک کی سیر کی، سیاست دانوں کی قربت میں رہے، رسائل و جرائد سے واابستہ رہے اور خود بھی رسائل و جرائد نکالے، نیز انھوں نے اپنی زندگی میں بہت سے تجربات کیے اور ان تجربات کو ہی انھوں نے آپ بیتی کا حصہ بنایا۔ آپ بیتی عام طور پر زندگی کے اُس مرحلے میں لکھی جاتی ہے، جب ہم زندگی کے نشیب و فراز اور مختلف تجربات سے دوچار ہو چکے ہوتے ہیں۔ محمود شام نے بھی بھرپور زندگی گزارنے کے بعد بڑھاپے میں آکر اپنے تمام تجربات کو اس میں بکھیر دیا ہے۔ عموماً ان کی دیگر تصانیف میں بھی وہ زندگی کے خاتمے کا استعارہ استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ شب بخیر اور انجام بخیر وغیرہ۔ اب مصنف اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ ان کی زندگی کی شام ہو چکی ہے اور وہ اُخروی زندگی کی طرف گامزن ہیں۔

علی اکبر ناطق کی آپ بیتی "آباد ہوئے برباد ہوئے"

"آباد ہوئے برباد ہوئے" اکیسویں صدی کی آپ بیتیوں میں ایک اہم اضافہ ہے، جس کا اندازِ تحریر خوب صورت اور پیش کش عصری تقاضوں کے مطابق ہے۔ علی اکبر ناطق جو کہ بطور ناول نگار اور افسانہ نگار اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ یہ آپ بیتی اُن کے ادبی کارناموں میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ یہ آپ بیتی مارچ ۲۰۲۳ء میں بُک کارنر جہلم پاکستان سے ۳۹۸ صفحات پر مشتمل شائع ہوئی۔ آپ بیتی نو ابواب پر مشتمل ہے اس تقسیم کی تفصیل درج ذیل ہے۔ باب اوّل ۴۷ صفحات اور ۲۶ ذیلی عنوانات، باب دوم ۱۳ صفحات اور ۸ ذیلی عنوانات، باب سوم ۴۷ صفحات اور ۳۷ عنوانات، باب چہارم ۴۷ صفحات اور ۲۲ عنوانات، باب پنجم ۵۹ صفحات اور ۲۹ ذیلی عنوانات، باب ششم ۳۱ صفحات اور ۲۱ ذیلی عنوانات، باب ہفتم ۴۱ صفحات اور ۲۲ ذیلی عنوانات، باب ہشتم ۱۸ صفحات اور ۱۷ ذیلی عنوانات اور باب نہم ۲۲ صفحات اور ۱۰ ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ اس طرح صفحات کے لحاظ سے دوسرا باب سب سے مختصر ہے، جو کہ ۱۳ صفحات پر مشتمل ہے اور پانچواں باب سب سے طویل ہے، جو کہ ۵۹ صفحات پر مشتمل ہے، نیز ذیلی عنوانات کے لحاظ سے سب سے مختصر باب دوم ہے، جس میں ۸ ذیلی عنوانات ہیں اور سب سے طویل باب سوم ہے، جس میں ۳۷ ذیلی عنوانات ہیں۔ "آباد ہوئے برباد ہوئے" کے مصنف ناول نگار ہونے کے باعث واقعات کو طوالت دے دیتے ہیں، لیکن اُس کے باوجود یہ واقعات اپنا حسن اور دلچسپی برقرار رکھتے ہیں۔ آپ بیتی میں علی اکبر نے اکثر مقامات پر طنز بھی کیا ہے، انھوں نے طنز کرتے ہوئے پاکستان کے تعلیمی اور صحت کے نظام کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ مصنف سکول میں اپنے داخلے کا ذکر کرتے ہوئے سکول کے نظام پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اِن میں ہر اُستاد کم و بیش ایک جیسی قابلیت اور رویے کا حامل تھا۔ سب لسی شوق سے پیتے تھے۔ گیارہ بجے کے قریب چائے پیتے تھے۔ ایک ہی جیسی چھڑی استعمال کرتے تھے۔ کلاس کو کوئی سبق رٹنے کے لیے دے کر ایک ہی طرح سے اپنی کُرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتے تھے۔۔۔ اُستاد کی آنکھ کھلتے ہی دوبارہ رٹا شروع ہو جاتا تھا۔ میرے خیال میں تعلیم وہی تھی جو ہم اُستاد کی نیند کے دوران حاصل کرتے تھے۔ باقی سب رٹا تھا۔ (۱۴)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے تمام اساتذہ کو ایک جیسا کہا ہے کہ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتے اور بچوں کو کچھ رٹنے کے لیے دے دیتے، بچے جب اُن کو سوتے ہوئے دیکھتے تو کھیلنے لگتے اُن کے جاگتے ہی دوبارہ بلند آواز میں رٹا شروع ہو جاتا، یہاں علی اکبر نے نہ صرف اساتذہ کی عادات کا ذکر کیا ہے، بلکہ اُن کا بچوں کو سبق رٹنے کے لیے دے دینے پر طنز بھی کیا اور سکول کی تعلیم کو محض رٹا کہا ہے۔ اِسی طرح مصنف آج کل کی ٹیوشن سے غیر مطمئن نظر آتے ہوئے اور اِسے لوٹ مار کا نام دیتے ہیں۔ علی اکبر کا لہجہ بلاشبہ طنز کرتے ہوئے نرم ہے اور وہ طنز میں مزاح کے پہلو کو بھی پیش کرتے ہیں، لیکن یہی لہجہ جب تنقید میں تبدیل ہوتا ہے تو اِس میں مصنف کے لہجے میں سختی آجاتی ہے، جسے قاری آسانی سے محسوس کر سکتا ہے۔ مصنف نے اپنے ایک بچپن کے دوست آصف علی کا ذکر کرتے ہوئے اشرافیہ پر تنقید کی ہے، لکھتے ہیں:

> کوئی کیسے سمجھ سکتا ہے کہ اپنے بچپن کے نہایت نفیس اور پیارے دوست کی یہ طبعی اور ذہنی حالت دیکھ کر مجھے کتنا صدمہ پہنچا۔ بخُدا میرے اندر ایک زلزلہ اور بھونچال تھا۔ اُس کی معاشی اور ذہنی کیفیت دیکھ کر میرا دل ڈوب چکا تھا۔ مَیں اُن اشرافیہ کے منحوس چہروں پر کس طرح لعنت کروں جنھوں نے ہماری نسلوں کو اس پسماندگی تک پہنچا دیا۔ ہماری فکر کو قعرِ مذلت تک لے گئے۔ (۱۵)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے بڑے سنجیدہ لہجے میں اپنے دوست آصف علی کا ذکر کیا ہے اور اُس کی ذہنی حالت کو دیکھ کر بچپن کے آصف علی اور آج کے آصف علی کا تقابل کیا ہے اور اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان کے اشرافیہ پر لعنت کی ہے، جنھوں نے ہماری قوم کو اس طرف لگا دیا۔ آپ بیتی کے مصنف نے کچھ انوکھے الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے، جیسا کہ خاموشی کو ہر جگہ خموشی اور خاموش کو خموش لکھا ہے۔ اس کے علاوہ مہینا بادشاہ کی جگہ باتشاہ وغیرہ کے الفاظ ملتے ہیں۔ مصنف نے آپ بیتی میں واقعات بیان کرتے ہوئے چند منفرد الفاظ کا استعمال کیا ہے، جب وہ ایک واقعہ ختم کرتے ہیں تو الاماں، الامان، اللہ اللہ کے الفاظ کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ علی اکبر آپ بیتی میں گاؤں کی تہذیب، روایات اور اقدار کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں وہ خود بھی گاؤں کے ماحول سے متاثر ہیں، گاؤں کا قدرتی ماحول، یہاں کے لوگوں کی سادہ دلی اور یہاں کی روایات علی اکبر کو بہت پسند ہیں، جو ان کی تصانیف کا اہم جزو ہیں، چوں کہ وہ ایک فکشن کے لکھاری ہیں اس لیے انھوں نے آپ بیتی میں بھی افسانے اور ناول کا سا اُسلوب اختیار کیا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی علی اکبر کے شعر و فکشن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ناطق کے لیے اب یہ حکم لگانا مشکل ہے کہ ان کی اگلی منزل کہاں تک جائے گی کہ وہ ہر بار وہ پہلے سے چونکاتے ہیں ان کے تمام کام میں تازگی ہے۔ روایت اور شعور حیرت زدہ کرنے والا ہے جس طرح ان کا شعر اور پھر فکشن میں کام ہے اس سے پہلے ایسی روایت موجد نہیں ہے۔ (۱۶)

اس اقتباس میں شمس الرحمان فاروقی نے علی اکبر ناطق کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے کلام میں نیا پن اور تازگی ہے، وہ ہر بات پہلی بات سے الگ انداز میں چونکاتے ہوئے کرتے ہیں ان جیسا کام فکشن اور شاعری میں پہلے نہیں ملتا، بطور شاعر علی اکبر کو عام لوگوں کی نسبت شعری اصطلاحات استعمال کرنے میں کمال حاصل ہے۔ مصنف نے اپنی سوانح اور بچپن کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے نہ صرف گاؤں میں کھیلے جانے والے کھیلوں کا نام لکھا ہے، جیسا کہ لکڑ چٹالا کھیل کو کھیلنے کے لیے ایک لڑکا اپنی ٹانگ کے نیچے سے

لکڑ پھینکتا تھا اور دوسرا اُسے پکڑنے کے لیے جاتا تھا، جب دوسرا لڑکا واپس آتا تو کھیل کے باقی لڑکے درختوں پر چڑھ جاتے پھر دوسرے لڑکے نے سب کو درختوں پر چڑھ کر چھونا ہوتا تھا، وہ جسے چھو لیتا پھر اُس کی اگلی باری آجاتی۔ یہ کھیل آج کل ناپید ہو چکے ہیں، لیکن یہ آپ بیتی میں گاؤں کی تہذیب کے عکاس نظر آتے ہیں۔ اِن کھیلوں کے بیان کرنے میں مصنف نے کافی طوالت سے کام لیا ہے اور ہر ایک کھیل کو کھیلنے کا طریقہ طوالت سے درج کیا ہے۔ علی اکبر نے بچپن کے واقعات درج کرتے ہوئے میلا سجن ڈاکو کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ اُن سے پہلی ملاقات کا دلچسپ واقعہ طوالت سے پیش بھی کیا ہے۔ میلا سجن ڈاکو کا ذکر کرتے ہوئے علی اکبر نے گاؤں کی تہذیب کو پیش کیا ہے، جو دشمن کو بھی گندم کی روٹی اور تازہ کھانا کھلاتے ہیں، حالاں کہ اُس دور میں گندم کی روٹی امیر لوگ کھاتے تھے اور دن میں سالن نہیں بنتا تھا، لسی یا دودھ وغیرہ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ آپ بیتی میں مصنف نے گاؤں کی تہذیب کو جگہ جگہ پیش کیا ہے۔ گاؤں کی عورتوں کے روزمرہ معمول کو بیان کرنے کے لیے علی اکبر نے اپنی دادی اور اپنی ماں کے روزمرہ کے کاموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میری والدہ اور دادی کے روزمرہ کے کاموں میں چکی پیسنا اور دودھ بلونا شامل تھا۔ ان دونوں کاموں میں بہت محنت لگتی تھی اور یہ کام پہلوان کی ورزش سے کم کسی طرح نہ تھے۔ اِس کے بعد مصنف نے آج کی عورتوں اور اُس دور کی عورتوں کا تقابل کرتے ہوئے طنز بھی کیا ہے کہ یہی ورزش تھی، جس کی وجہ سے اُن میں قوتِ برداشت زیادہ ہو جاتی تھی اور وہ بچہ پیدا ہوتے وقت فوت نہیں ہوتیں تھیں۔ گاؤں کی تہذیب میں مصنف نے عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے اسی طوالت سے مردوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ مرد دن کے وقت کام کاج کی غرض سے باہر رہتے تھے اول تو وہ فارغ نہیں ہوتے تھے اور اگر فارغ ہوتے بھی تو چوکوں میں ٹولیوں کی شکل میں بیٹھ کر گپیں ہانکتے یا حقہ پیتے، یہاں مصنف نے گاؤں کی تہذیب کو بیان کیا ہے کہ اُس دور میں مردوں کا گھر میں رہنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

علی اکبر نے گاؤں کے لوگوں کی تہذیب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گاؤں میں عشا کی اذان کے بعد جاگنے اور صبح کی اذان کے بعد سونے کو نحوست خیال کیا جاتا تھا، اس لیے وہ لوگ اِن اوقات میں سونے اور جاگنے سے گریز کرتے تھے۔ آپؐ نے فجر کی نماز کے بعد سونے کو ناپسند کیا ہے، اِسی طرح بغیر شرعی عذر کے عشا کی نماز کے بعد گھر سے باہر رہنے کو بھی احکاماتِ شریعت میں اچھا نہیں سمجھا جاتا، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں گاؤں کے لوگ مذہب کے بھی قریب ہوتے تھے۔ علی اکبر نے آپ بیتی میں نہ صرف گاؤں کی تہذیب بلکہ کویت کی تہذیب کو بھی پیش کیا ہے دراصل اُن کے والد کچھ عرصہ کویت میں رہے اُن دِنوں میں خطوں کا رواج تھا اس دوران اُن کے والد نے کچھ خطوط اپنے گھر والوں کو بھیجے، جس کا ذکر مصنف نے آپ بیتی میں یوں کیا ہے:

> اِن خطوں میں ایک بات والد صاحب نے بہت دفعہ لکھی تھی، وہ تھا صحرا۔ وہ جس کمپنی کے ساتھ کام کر رہے تھے اُس نے شہری کالونیاں بنانا تھیں اور یہ سارا کام کویت کے صحراؤں میں تھا۔ والد صاحب کہتے ہیں۔ کویت کے بدو بیابانوں میں خیمے لگا کر رہتے تھے۔ ایک دو مہینے بعد وہ خیمہ وہیں چھوڑ کر ایک نئی جگہ پر نیا خیمہ لگا لیتے تھے۔۔۔ کویت کے بدوؤں کی مرغوب غذا اونٹ کا گوشت اور اونٹ کا ہی دودھ تھا۔ دنبے بھی کھاتے تھے مگر اونٹ کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ (۱۷)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے کویت کی تہذیب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ لوگ صحرا میں رہنا اتنا زیادہ پسند کرتے تھے کہ حکومت انھیں شہروں میں آباد کرتی تو وہ دوبارہ صحرا کا رُخ کرتے، پھر کچھ عرصہ صحرا میں عارضی خیمے لگا لیتے اور ایک دو مہینوں کے بعد وہ خیمے وہاں ہی چھوڑ کر کہیں چلے جاتے یہ خیمے کویتی گورنمنٹ اکٹھے کرتی اور افریقہ کے مسلمان ملکوں کو ہدیہ کر دیتی۔

"آباد ہوئے برباد ہوئے" میں علی اکبر نے گاؤں کی تہذیب پیش کی ہے، اس لیے پنجابی زبان کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے بعض مقامات پر پورے پورے جملے پنجابی زبان کے درج کیے گئے ہیں۔ مصنف نے آپ بیتی میں گاؤں کے قدرتی مناظر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ گاؤں میں استعمال ہونے والی بعض اصطلاحات کی وضاحت بھی ملتی ہے۔ آپ بیتی میں لاہور اور اوکاڑا جیسے شہروں کے نہ صرف نقشے ملتے ہیں بلکہ وہاں کی ادبی شخصیات اور مشاعروں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ آپ بیتی کے کرداروں کی شخصیت بھی پیش کی گئی ہے۔ مزاح کرتے ہوئے علی اکبر کا لہجہ نرم ہے، لیکن یہی لہجہ جب طنز کی صورت اختیار کرتا ہے تو تلخ ہو جاتا ہے۔ مصنف قدیم روایات کا جدید روایات سے تقابل کرتے ہوئے قدیم روایات سے متاثر نظر آتے ہیں، اس لیے آپ بیتی میں بعض مقامات پر پند و نصائح کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ علی اکبر نے آپ بیتی میں تشبیہات، محاورات اور تلمیحات کا بھی ذکر کیا ہے، نیز اپنی تخلیقات درج کرتے ہوئے اُن پر نرگسیت کا غلبہ واضح نظر آتا ہے۔ یہ آپ بیتی واقعات در واقعات کی حیثیت رکھتی ہے۔ بعض واقعات میں مصنف نے بے جا طوالت اختیار کی ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے واقعات کی چاشنی کو برقرار رکھا ہے۔

آپ بیتی میں علی اکبر کا اُسلوب بہت دلچسپ ہے، اُنھوں نے آپ بیتی کے اُسلوب کو چار چاند لگاتے ہوئے مختلف حربوں کا استعمال کیا ہے، جن میں خاکہ نگاری، منظر کشی، شخصیت نگاری کے علاوہ تشبیہ، تلمیح اور محاورے کا استعمال بھی کیا ہے۔ یہ حربے قاری کو لبھاتے ہوئے آغاز سے انجام تک پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ آپ بیتی کا اُسلوب معلوماتی نوعیت کا ہے۔ علی اکبر نے بعض مقامات پر معلومات دی ہیں۔ مصنف نے آپ بیتی کے اُسلوب میں منفرد الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے، جیسا کہ خاموش کو خموش، خاموشی کو خموشی وغیرہ یہ ایسے الفاظ ہیں، جو "آباد ہوئے برباد ہوئے" سے پہلے منظرِ عام پر نہیں آئے۔ علی اکبر کا اُسلوب گاؤں کی تہذیب کا عکاس ہے۔ علی اکبر نے ایک منفرد اُسلوب اختیار کیا ہے، جب وہ ایک واقعہ کا اختتام کرتے ہیں تو آخری پیراگراف میں اُن کا لہجہ تبدیل ہو جاتا ہے، اس میں یا تو وہ طنز کرتے ہیں یا پھر دُنیا کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔ "آباد ہوئے برباد ہوئے" کے مصنف نے ایک شان دار زندگی گزاری، جس میں وہ کئی مشکلات سے دوچار ہوئے۔ بلاشبہ وہ گاؤں کے ماحول کو پسند کرتے ہیں، لیکن اس ماحول میں موجود بہت سی کمزوریوں کو بھی قبول کرتے ہیں، جیسا کہ گاؤں میں معیاری تعلیم کا نہ ہونا، ہسپتال اور بازار وغیرہ جیسی بنیادی ضروریات کا نہ ہونا وغیرہ ان سب سے زیادہ جہاں انھوں نے اپنے بچپن کے ٹھاٹھ کا ذکر کیا ہے وہاں اپنی غربت کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن انھوں نے ان نشیب و فراز کو نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ کمال عیاری سے اپنی حسِ مزاح کا استعمال کرتے ہوئے درج بھی کیا ہے۔ وہ زندگی میں کئی مشکلات سے دوچار ہوئے، لیکن کہیں بھی نہیں گھبرائے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آپ بیتی کا نام ہی اِسی مناسبت سے رکھا ہے کہ آباد ہوئے برباد ہوئے۔

علی اکبر کی آپ بیتی پر مصنف کے فقہ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ مصنف فقہ جعفریہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے انھوں نے اس فقے کی چند ایک تفصیلات کو آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ آپ بیتی میں انھوں نے گاؤں کے علاوہ کویت اور سعودی عرب کی تہذیب بھی پیش کی ہے۔ اپنی تخلیقات میں ناول، افسانے، نظمیں اور غزلیں نیز اپنے گورے رنگ اور کثرتِ مطالعہ کا ذکر کرتے ہوئے مصنف پر خود نمائی کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اوکاڑا کے ادبی ماحول کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے مشاعروں، ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کیا ہے، جو کہ آپ بیتی میں تذکرہ نویسی کے عناصر کو شامل کرتا ہے۔ علی اکبر نے آپ بیتی میں اخلاقیات کے دامن کو داغ دار نہیں کیا، لیکن ایک مقام پر انھوں نے گاؤں کی پنچایت میں ہونے والے فیصلے کا ذکر کرتے ہوئے لغوی گفتگو کی ہے۔

"آباد ہوئے برباد ہوئے" آپ بیتی چند خامیوں کے باوجود فنی، فکری اور اُسلوبی لحاظ سے اُردو ادب میں اہم مقام رکھتی ہے۔ مصنف نے اپنی سوانح پیش کرتے ہوئے نہ صرف اپنے خاندان بلکہ اپنے گاؤں، دوستوں اور اساتذہ کا ذکر بھی کیا ہے، لیکن انھوں نے کہیں اپنی شادی یا بچوں کا ذکر نہیں کیا، اس طرح آپ بیتی میں تصویرِ زندگی کے کچھ رنگ بیان نہیں کیے گئے۔ آپ بیتی کے بعض واقعات میں مصنف بے جا طوالت سے کام لیتے ہیں جو آپ بیتی میں سقم پیدا کرتا ہے، جیسا کہ اوکاڑا کا ذکر کرتے ہوئے اس کے گرد نواح کے گاؤں اور قصبوں کا ذکر ضروری نہ تھا۔ علی اکبر گاؤں کی تہذیب سے متاثر تھے، اس لیے انھوں نے آپ بیتی میں بعض مقامات پر قدیم اور جدید تہذیب کا موازنہ کرتے ہوئے گاؤں کی پُرانی روایات کو پسند کیا ہے اور جدید دور پر تنقید کی ہے۔ آپ بیتی میں تنقید کرتے ہوئے اُن کا لہجہ تلخ اور بے باک نظر آتا ہے۔

"پاپ بیتی"، "شام بخیر" اور "آباد ہوئے برباد ہوئے" اردو ادب کے نثری سرمایے میں اہم اضافے ثابت ہوئے ہیں، اِن کے مصنفین آپ بیتی نگار ہونے کے علاوہ شاعر بھی ہیں اِس لیے انھوں نے اپنے منفرد ذوقِ جمال سے اِن کی خوب صورتی کو چار چاند لگائے ہیں۔ شعرا دراصل عام نثر نگاروں کی نسبت زیادہ حساس ہوئے ہیں اور اُن کا تخیل دوسروں سے زیادہ بلند ہوتا ہے، جو اُن کی نثری تصانیف میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ ساقی فاروقی کی آپ بیتی میں غالب رویہ ایک نقاد کا نظر آتا ہے وہ چھوٹی چھوٹی بات پر اپنے حساسیت کی بنا پر شعرا اور ادبا کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، اور اس تنقید میں ان کا لہجہ اور الفاظ تلخی اختیار کر جاتے ہیں۔ پاپ بیتی میں مصنف نے چند جدید اصطلاحات اور املا کا بھی استعمال کیا ہے، جو اس آپ بیتی سے پہلے نہیں دیکھی گئی۔ محمود شام ایک صحافی ہیں اس لیے اُن کی آپ بیتی میں صحافتی حوالے سے اہم معلومات ملتی ہیں۔ محمود شام نے اپنی زندگی کا زیادہ تر وقت سیاست میں اور سیاسی شخصیات کے ساتھ گزارا ہے، جس کا ذکر اُنھوں نے آپ بیتی میں کیا ہے، اس لیے اُن کی آپ بیتی میں سیاسی شخصیات اور خاص طور پر ذوالفقار علی بھٹو اور اُن کی پارٹی کے بارے میں اہم معلومات ملتی ہیں۔ علی اکبر ناطق کی آپ بیتی میں غالب رویہ ایک فکشن رائٹر کا نظر آتا ہے، کیوں کہ ان کی شہرت افسانہ اور ناول لکھنے کی وجہ سے زیادہ ہوئی ہے اس لیے ان کی آپ بیتی میں تہذیب اور خاص طور پر گاؤں کی تہذیب کا عکس نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ علم الدین سالک، آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو، مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، لاہور، ادارہ فروغِ اُردو، ۱۹۶۴ء، ص: ۵۴

۲۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، (لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص: ۱۵۔۱۴

۳۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبین شاہد نواز، محمد نعیم، شعبہ اُردو یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۶ء، ص: ۳۴

۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر، غیر شعر اور نثر، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ۱۹۷۳ء، ص: ۳۰

۵۔ ساقی فاروقی، پاپ بیتی، نئی دہلی، ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء، ص: ۱۲۹

۶۔ ساقی فاروقی، پاپ بیتی، ص: ۱۳۶

۷۔ ایضاً، ص: ۵۵

۸۔ مشفق خواجہ، خامہ بگوش کے قلم سے، لاہور، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۱۹۹۵ء، ص: ۶۲

۹۔ ساقی فاروقی، پاپ بیتی، ص:۴۳

۱۰۔ محمود شام، شام بخیر، اٹلانٹس پبلی کیشنز کراچی، ۲۰۲۳ء، ص:۹۴

۱۱۔ محمود شام، شام بخیر، ص:۵۵۸

۱۲۔ ایضاً، ص:۶۷۹

۱۳۔ ڈاکٹر غلام شبیر رانا، ہم نے لفظوں کے مکانوں میں گزاری زندگی، مشمولہ عبارت، جلد ۱۲، شمارہ ۴۹، ص:۱۴۸

۱۴۔ علی اکبر ناطق، آباد ہوئے برباد ہوئے، جہلم، بک کارنر، ۲۰۲۳ء، ص:۱۱۳

۱۵۔ علی اکبر ناطق، آباد ہوئے برباد ہوئے، ص ۱۳۵۔۱۳۴

۱۶۔ شمس الرحمان فاروقی، پس سرورق، نو لکھی کوٹھی، ص: ندارد

۱۷۔ علی اکبر ناطق، آباد ہوئے برباد ہوئے، ص ۱۰۹

References in Roman Script:

1. Ilm-ud-Deen Salik, Aap Beetiyon ke Baaz Numaya Pehlu, *Mashmula* Naqoosh, Aap Beeti Number, Lahore, Idara Farogh-e-Urdu, 1964, p. 54.
2. Dr. Rafiuddin Hashmi, Asnaaf-e-Adab, Lahore, Sang-e-Meel Publications, 2018, p. 14–15.
3. Altaf Hussain Hali, Muqaddama Sher-o-Shairi, Murattibeen: Shahid Nawaz, Muhammad Naeem, Shoba Urdu, University of Sargodha, 2016, p. 34.
4. Shamsur Rahman Faruqi, Sher, Ghair Sher aur Nasr, New Delhi, National Council for Promotion of Urdu Language, 1973, p. 30.
5. Saqi Faruqi, Paap Beeti, New Delhi, M.R. Publications, 2016, p. 129.
6. Saqi Faruqi, Paap Beeti, p. 136.
7. Ibid., p. 55.
8. Mushfiq Khwaja, Khama Bagosh ke Qalam *Se*, Lahore, Pakistan Writers Cooperative Society, 1995, p. 62.
9. Saqi Faruqi, Paap Beeti, p. 43.
10. Mehmood Shaam, Shaam Bakhair, Atlantis Publications, Karachi, 2023, p. 94.
11. Mehmood Shaam, Shaam Bakhair, p. 558.
12. Ibid., p. 679.
13. Dr. Ghulam Shabbir Rana, Hum Ne Lafzon ke Makanon Mein Guzari Zindagi, Mashmula Ibaraat, Vol. 12, No. 49, p. 148.
14. Ali Akbar Natiq, Aabaad Hue Barbaad Hue, Jhelum, Book Corner, 2023, p. 113.
15. Ali Akbar Natiq, Aabaad Hue Barbaad Hue, p. 134–135.
16. Shamsur Rahman Faruqi, Pas Sar Warq, No Lakhhi Kothi, p. n.d.
17. Ali Akbar Natiq, Aabaad Hue Barbaad Hue, p. 109.